تاریخ کا جہاز

اب پاکستان کو بنے اور ہندوستان کو آزاد ہوئے پچاس برس ہو رہے ہیں۔ دونوں طرف اپنی اپنی گولڈن جوبلی منانے کی تیاریاں تھیں۔ تاریخ کی اس گھڑی کو ان روزوں کو جن پر پچاس برسوں کی گرد پڑ چکی تھی پھر سے کریدا جا رہا تھا۔ اور لیجیے ہمیں بھی کسی نے پوچھا کل تک طعنے مل رہے تھے کہ یہ شخص نوسٹالجیا کا مریض ہے۔ ہم نے جو پٹاری بند کر کے طاق نسیاں میں رکھ دی تھی اسے یہ روگی ہنوز کھولے بیٹھا ہے۔ مگر اب دور و نزدیک سے فرمائشیں آ رہی تھیں کہ ان دنوں کی یادیں قلمبند کر کے ہمیں نوازئے۔ اور فرمائشیں پاکستان سے کم باہر سے زیادہ۔ انڈیا انٹرنیشنل سنٹر کے رسالہ کی فرمائش کو میں نے رسمی دعوت نامہ جانا تھا۔ مگر چند ہی دنوں بعد اس کی ایڈیٹر گیتی سین لاہور میں آن دھمکیں۔ آرٹسٹوں دانشوروں کو ٹوہتی پھر رہی تھیں کہ اس باب میں کس سے کیا لکھوایا جائے۔ ادھر گوئٹے انسٹی ٹیوٹ نے ایک ایسی ہی فرمائش کر ڈالی۔ اور یہ تو کراچی کی بات تھی۔ برلن سے ہاؤس آف ورلڈ کلچر نے ہندوستان سے اور پاکستان سے چند ادیبوں کو ایسی ہی ایک تقریب کے لیے بلا بھیجا۔ جرمن اس باب میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لیتے نظر آئے۔ شاید وہ اپنی تقسیم کے تجربے کو ہماری تقسیم کے تجربے سے موازنہ کر کے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اسی گہما گہمی میں پی ٹی وی کے ایک انٹرویو لینے والے نے (شاید یہ نعیم بخاری تھے) مجھ سے ایک سوال کر ڈالا ''انتظار صاحب آپ نے کس تصور کے تحت ہجرت کی تھی۔''

الفاظ یہ نہ ہوں' خلاصہ اسی کا یہی تھا۔ مجھے اس کے سوا کوئی جواب نہ بن پڑا کہ اکھڑی ہوئی خلقت کا ایک سیلاب امنڈا ہوا تھا۔ اور سیلاب میں بہت سا خس و خاشاک بھی بہتا چلا آتا ہے۔ تو بس ایسے ہی یہ تنکا بھی بہہ کر یہاں چلا آیا۔

ٹی وی اور اخباروں کے انٹرویوز میں جو سوال کیے جاتے ہیں ان کے سلسلہ میں زیادہ تردد تو نہیں ہونا چاہیے۔ مگر ہوا یہ کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ کچھ اسی سے ملتے جلتے سوال ادھر سے آنے والے بعض نامور ادیبوں' دانشوروں سے کیے گئے۔ اور انہوں نے بڑے ٹھکانے سے اپنی ہجرت کی توجیہہ کی۔ بتایا کہ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے کس سرگرمی سے تحریک پاکستان کے جلسوں میں حصہ لیا تھا' کس جوش و خروش سے نعرے لگائے تھے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ مل کر کس طرح تحریک کے لئے کام کیا تھا۔ اور پھر جب پاکستان بن گیا تو اس نوزائیدہ مملکت کی خدمت کے جذبے نے کیسے انہیں اکسایا اور وہ گھر بار چھوڑ کر کس حال میں

یہاں پہنچے۔

ہجرت کی ان توجیہات کو سن کر اس سوال نے مجھے پھر سے آن گھیرا۔ میں نے سوچا کہ ہجرت کی ایسی ہی معقول توجیہہ میرے پاس بھی ہونی چاہیے۔ تب میں نے بیتے دنوں کو یاد کیا' میرٹھ والے دنوں کو' مگر نہ کسی سٹوڈنٹس یونین میں اپنی شرکت کی یاد آئی' نہ کسی سیاسی پارٹی کے جلسے جلوس کی ایسی یاد آئی کہ اس میں شامل ہو کر نعرہ لگایا ہو یا کم از کم تماشائی کی حیثیت ہی سے چار قدم ساتھ چلا ہوں۔ جب شام پڑے میں گھنٹہ گھر سے گزر کر اپنے ٹھکانے کی طرف جاتا ہوں تو درمیان میں ٹاؤن ہال پڑتا تھا۔ کانگریس مسلم لیگ دونوں کے جلسے اسی کے میدان میں ہوا کرتے تھے۔ تو جب میں شام پڑے اس راہ سے گزرتا تو لاؤڈ سپیکر پر شور تقریروں سے جھنجھنا رہے ہوتے۔ بس میں ایک ہی دفعہ اس راہ پر ٹھٹکا تھا۔ اس شام جب پتہ چلا کہ آج مولانا حسرت موہانی آئے ہوئے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے جلسہ کو خطاب کریں گے۔ مجمع بہت تھا۔ بجلی کے ہنڈوں کی روشنی کم تھی۔ حسرت موہانی کی صورت مجھے ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ان کی آواز میں بھی گھن گرج نہیں تھی۔ میں بور ہو کر جلدی ہی واپس ہو لیا۔

اچھا یہ پہلو اگر خالی تھا تو لٹنے پٹنے ہی کی کوئی داستان میرے پاس ہوتی۔ وہ بھی کوئی برآمد نہیں ہوئی۔ اپنے اس بے کیف ماضی نے مجھے بہت مایوس کیا۔ میرے پاس سنانے کے لئے کوئی کہانی اور کرنے کے لئے کوئی دعوی نہیں تھا۔ عجیب بات ہے کہ تقسیم کے اثر سے پیدا ہونے والے ادب پر اکا دکا مضمون جو میں نے لکھا اس میں اس وقت کی ہجرت کے عمل کو تو برا بھلا سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ اس سے یاروں نے ایک فلسفہ ہجرت مجھ سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ مقصود صرف اتنا تھا کہ جب اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی ہے تو اسے اپنی تاریخ کے کسی بڑے تجربے کے ساتھ پیوست کر کے دیکھا جائے کہ شاید اس سے اس عمل میں کوئی بڑے معنی پیدا ہو جائیں۔ مگر اپنی نجی نقل مکانی کو کسی قسم کے معنی پہنانے کا یا افیڈیلائز کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

رہا ملک اور قوم کی خدمت کا جذبہ تو خود خدمت کا لفظ مجھے اتنا بھاری نظر آتا ہے کہ لگتا ہے کہ اسے اپنایا تو اس کے نیچے دب کر رہ جاؤں گا۔ عمر اردو میں قلم چلاتے اور کہانیاں لکھتے ہی گزری ہے لیکن اردو کی خدمت یا ادب کی خدمت توبہ توبہ' اس متبذل تصور کا تو میں متحمل ہی نہیں ہو سکتا۔

تو مجھے کیا پتہ تھا کہ پاکستان میں پچاس برس گزارنے کے بعد مجھ سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے کیا سوچ کر اس مبارک سرزمین پر قدم رکھا تھا اور میرے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ میں اپنا بہت دھیان دوڑاتا ہوں تو بس اتنا ہی دھیان میں آتا ہے کہ مسافروں سے اٹا اٹ بھری ایک ریل گاڑی ہے کہ آباد اور اجڑی بستیوں کے بیچ سے گزرتی دوڑی چلی جا رہی ہے' اجالے میں

پھر اندھیرے میں۔ ایک اٹھاہ ڈراؤنا اندھیرا' مسافر ٹھسا ٹھس مگر جیسے پتھر کے بنے ہوں۔ سانس تک کی آواز نہیں۔ گاڑی سے باہر نہ آدمی نہ آدم زاد۔ دور دور تک اندھیرے کا ڈیرا۔ اور گاڑی کہاں جا کر رکے گی کچھ خبر نہیں۔ اور اگر رک گئی تو کبھی چلے گی بھی' کچھ خبر نہیں۔

اب پچاس برسوں کے گزرنے پر سمجھ میں آ رہا ہے کہ وہ تو دو وقتوں کے ملنے اور جدا ہونے کی گھڑی تھی۔ صبح و شام کے چھٹپٹے میں دو وقت کیسے چشم زدن میں ملتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں۔ پتہ چلتا ہے کہ پہر بدل گیا۔ تاریخ کے اپنے صبح و شام ہوتے ہیں' اپنے ڈھلتے چڑھتے پہر۔ تو وہ تاریخ کا چھٹپٹا تھا۔ ہم پر ایک پہر جا رہا تھا' دوسرا پہر آ رہا تھا۔ جب ہی تو میرٹھ سے لاہور تک کا مختصر سفر قیامت کا سفر بن گیا۔ جیسے گاڑی میں نہیں بیٹھے' تاریخ کے جہاز میں بیٹھے ہیں۔ اور بے اختیار بیٹھے ہیں۔ گھر سے منہ اندھیرے نکلے تھے۔ اب دوپہر ہونے لگی ہے۔ سہارنپور کا سٹیشن گزر گیا ہے۔ یعنی یوپی کی سرحد سے نکل کر اب اس دیار سے گزر رہے ہیں جہاں کل تک بہت قیامت مچی ہوئی تھی۔ اب سناٹا ہے۔ جن کی قسمت میں نکلنا تھا وہ نکل گئے۔ جن کے لکھے میں کھیت ہونا تھا وہ کھیت ہو گئے۔ اب ان کے نام قریب و دور کچھ جلے پھنکے گھر نظر آ رہے ہیں۔ جہاں تہاں اجڑی پجڑی بستیاں۔ اور گاڑی ہے کہ ان سے بے نیاز دوڑی چلی جا رہی ہے۔ سہانپور تک تو ہر سٹیشن پر باقاعدہ رکتی تھی۔ پھر سیٹی بجتی' ہری جھنڈی دکھائی جاتی اور بھرے سٹیشن سے دھیرے دھیرے کر کے نکلتی۔ پلیٹ فارم پر کھڑے بیٹھے مسافر پیچھے سرکتے جاتے' گاڑی آگے سرکتی جاتی۔ پھر بتدریج رفتار میں تیزی آتی۔ مگر اب سماں دوسرا ہے۔ کسی سٹیشن پر نہیں رک رہی۔ بلکہ جب سٹیشن آتا ہے تو اس کی رفتار مزید تیز ہو جاتی ہے۔ مگر لیجئے رک گئی۔ اور کس شان سے رکی ہے کہ مسلح گارڈ ڈبوں کے آگے کھڑی پہرہ دے رہی ہے۔ مجال ہے کہ پلیٹ فارم پر چلتے پھرتے لوگوں میں سے کوئی گاڑی کے قریب آ جائے۔ کرپان سے مسلح سکھ دور دور سے ہمیں گھورتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر کتنے بہت سے شرنارتھی ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ بیزاری سے ہمیں دیکھتے ہیں اور پھر بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ اور اے لو شرنارتھیوں سے لدی پھندی ایک سپیشل مخالف سمت سے چل کر ٹھیک ہماری سپیشل کے متوازی کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ کتنی ستم رسیدہ خون بھری نظریں ہماری نظروں سے چار ہوتی ہیں۔ مسافر اندر ٹھسا ٹھس۔ چھت پر جو مسافر لدے ہوئے ہیں وہ ان پر مستزاد۔ یا اللہ گاڑی جب تیز چلتی ہو گی تو یہ کیسے خود کو سنبھالتے ہوں گے۔ مگر جب لوگ جانیں لے کر بھاگتے ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے۔ نکلنے کی کوئی بھی صورت ہو غنیمت نظر آتی ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت بڑا سہارا نظر آتا ہے۔ مگر ہماری گاڑی چلتی کیوں نہیں۔ گاڑی سرکے تو غضبناک نظروں کی زد سے نکلیں۔ مگر گاڑی تو جم کر کھڑی ہے۔ سرکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔

خیر دن تو جیسے تیسے گزر گیا۔ اب کالی رات ہے اور ہم ہیں۔ اور کالی سی کالی۔ باہر بھی اندھیرا' اندر بھی اندھیرا۔ انجن کی روشنی بھی غائب ہے۔ اندھی گاڑی اندھیرے میں دوڑ رہی ہے۔ اور تاریک ڈبے میں مسافریوں بیٹھے ہیں جیسے آدم زاد نہیں' بھوت ہیں۔ اور اندھی گاڑی کیسے خوفناک انداز میں دوڑ رہی ہے۔ راہ میں آنے والے سٹیشنوں کو مطلق خاطر میں نہیں لا رہی۔ اندھا دھند دوڑے چلی جا رہی ہے۔ ہم ایک بے حس نابینا انجن کے رحم وکرم پر ہیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہے ہیں۔ سو طرح کے وسوسوں نے گھیر رکھا ہے۔ اے لو گاڑی رک گئی۔ یہ اچانک بیچ اندھیرے جنگل میں کیوں رکی ہے۔ دل اور زور زور سے دھڑکنے لگے۔ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سانس لینے کی بھی آواز نہیں۔ اندر باہر گھپ اندھیرا۔ ہاں بیچ بیچ میں سرچ لائٹ جھلک مارتی ہے۔ کچھ مسلح سپاہی نیچے اترے ہوئے ہیں۔ شاید انہوں نے خطرے کو سونگھا ہے۔ سرچ لائٹ روشنی کا احساس نہیں دلاتی' خطرے کے احساس میں شدت پیدا کر رہی ہے۔

میرے برابر ہلکی سی جنبش ہوتی ہے۔ برابر میں بیٹھے بھوت نے ماچس کی تیلی کو ڈبیا پر گھسا اور اور اچانک بھوتوں میں کھلبلی مچ گئی' کون ہے یہ۔ سگریٹ بجھاؤ۔ بجھاؤ سگریٹ۔'' میرے برابر جو بھوت بیٹھا ہے اور جس نے سگریٹ سلگائی ہے وہ اصل میں سلیم احمد ہے۔ بھلے مانس کو کیسے وقت میں سگریٹ کی طلب ہوئی ہے۔ سگریٹ اسے بجھانی پڑتی ہے۔ اور پھر پھریری لیتا ہے'' یار اس پہ مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔'' لطیفہ سناتا ہے۔ پوری ٹولی جسے وہ ساتھ لیکر میرٹھ سے نکلا تھا ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ غضبناک آنکھیں اندھیرے میں سلیم کو گھور رہی ہیں۔

''آپ لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔'' اندھیرے میں ایک غصیلی آواز۔

''کس بات پر پ'' سلیم معصومیت سے پوچھتا ہے۔

ایک بوڑھی عورت جس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اپنا سفید برقعہ اتار کر الگ رکھ دیا ہے شفقت بھرے لہجہ میں کہتی ہے

''پوت یہ ہنسی ٹھٹھے کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت کلمہ پڑھنا چاہیے۔''

''کلمہ میں ایمان ہو تو پڑھیں گے کلمہ۔'' وہی غصیلی آواز۔

ڈبے کے برابر سے گارڈ کو گزرتے دیکھ کر ٹولی کا ایک نوجوان پھریری لیتا ہے'' گارڈ صاحب' حملہ کتنی دیر میں ہو رہا ہے۔'' گارڈ ٹھٹھکتا ہے۔ پھر'' شٹ اپ'' کہہ کر آگے گزر جاتا ہے۔

ٹولی پھر ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔

''میں اس گارڈ کو جانتا ہوں۔ وہ جن سنگھیوں سے ملا ہوا ہے۔ جب ہی تو میرے فقرے پر اسے تتے لگ گئے۔'' وہ جیسے اپنے کھسیان پٹ کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہو۔

گاڑی حرکت میں آتی ہے۔ نہ سیٹی نہ جھنڈی۔ نہ پہیوں کی گڑگڑاہٹ۔ جیسے بے سدھ بیر بہوٹی نے بالآخر پنجے کھول کر رینگنا شروع کر دیا ہو۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' بوڑھی عورت کی اطمینان بھری آواز۔

مگر گاڑی تو تھوڑی دور چل کر پھر رک گئی۔ پھر دل دھڑ دھڑ کرنے لگے۔ ''حملہ ہونے والا ہے۔'' کسی نے سرگوشی میں کہا۔ اور سلیم کو پھر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ٹولی نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔

''اے بیٹو! خدا کا خوف کرو۔'' بڑی ہی بیچارگی سے بولیں۔''

''یار تو چپ نہیں رہ سکتا۔ سکھ بعد میں حملہ کریں گے' پہلے یہ..... '' پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا۔

خیر گاڑی چل پڑی۔ ''الٰہی تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' اطمینان کا لمبا سانس۔ اطمینان کہ حملہ کا خطرہ ٹل گیا۔ مگر اطمینان کی پچھلی گھڑیوں کی طرح یہ اطمینان کی گھڑی بھی عارضی نکلی۔ جلدی ہی بیکلی شروع ہوگئی کہ گاڑی کی رفتار آخر تیز کیوں نہیں ہوتی۔ کیوں اس جنگل سے تیزی کے ساتھ نہیں گزر جاتی۔ بیکلی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ گاڑی ہے کہ چل نہیں رہی' رینگ رہی ہے۔ اور کب سے رینگ رہی ہے جیسے اسے رینگتے زمانہ گزر گیا ہو۔ عجب سا احساس ہو رہا ہے کہ جیسے زمانہ پہلے اس سفر پر نکلے تھے۔ زمانہ گزر گیا اور ہم اسی طرح چلے جا رہے ہیں۔ منزل پہ کب پہنچیں گے۔ پہنچ بھی پائیں گے یا بیچ ہی میں کھیت ہو جائیں گے۔ اس راہ اس سے پہلے کتنی گاڑیاں کٹ چکی ہیں۔ کتنی گاڑیاں منزل پر اس رنگ سے پہنچیں کہ تنگ پورے یعنی جتنے سوار ہوئے تھے اتنے ہی مگر زندہ کوئی نہیں۔ لاشیں ہی لاشیں۔ یہ ہم ہیں یا زمانہ قدیم کا کوئی قافلہ ہے کہ رینگتا ہوا چل رہا ہے اور جوکھوں بھری راہوں سے گزر رہا ہے۔ گاڑی سے باہر دن میں ایک اور منظر نظر آیا تھا۔ بیل گاڑیوں کی ایک لمبی قطار اٹبرا اپنے کاٹھ کباڑ کے ساتھ لدے ہوئے۔ اپنی بستیوں سے اجڑ کر نکل ہیں اور چلے جا رہے ہیں۔ گاڑی تیز دوڑ رہی ہے۔ مگر بیل گاڑیوں کی قطار کا کوئی انت نہیں ہے۔ جب باہر جھانکو قطار اسی طرح بندھی ہوئی۔ وہ کہاں جا رہے ہیں اور ہم۔ کچھ پتہ نہیں۔ بے یقینی' وسوسے' طرح طرح کے شک۔ سلیم کا وہی موڈ۔ ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے کہ وہ ڈرا ہوا نہیں ہے۔

مگر جب واہگہ کے قریب آئے تو سہمے ہوئے لوگوں نے کس پھرتی سے جھرجھری لی۔ کس سرعت سے بزدلی کو جھٹکا اور بہادر بن

گئے۔ اندھیرے ڈبے میں تقریریں شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے سلیم کو ٹہوکا ''اب وقت ہے تو بھی ایک تقریر لگا دے۔''

''میں چپ ہوں۔ اب دوسروں کے بولنے کا وقت ہے۔''

مغلپورہ کا سٹیشن یعنی لاہور آ گیا۔ میری منزل مقصود تو یہی ہے۔ عسکری صاحب کا خاندان بھی اترا پڑا ہے۔ یعنی ان کے تینوں بھائی، بہن، والدہ۔ سلیم کو اپنے گھر والوں اور اپنی ٹولی کے ساتھ کراچی جانا ہے۔

آسمان اجلنے لگا ہے۔ صبح کا دھندلکا ہے۔ پاکستان میں میری پہلی صبح۔

◆◆◆

گنگا جمنا کا پانی لاہور سے گزرا، کراچی بہہ گیا

پتہ نہیں یہ خواجہ معین الدین کے ڈرامہ ''لال قلعہ سے لالوکھیت تک'' کی برکت تھی یا اس علاقہ میں بسنے والے مہاجروں کا کمال تھا۔ بہرحال لالوکھیت نے پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بہت شہرت پائی۔ خیر لاہور میں ہمارا اپنا ایک لالوکھیت تھا۔ لالوکھیت تو لالو کھیت نہیں رہا' لیاقت آباد بن گیا۔ مگر کرشن نگر بدستور کرشن نگر چلا آتا ہے۔ اسے اسلام پورہ بنانے کی کوششیں ابھی تک تو بارآور ہوئی نہیں ہیں۔ میں نے پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد یہیں آنکھ کھولی تھی۔

خوب جگہ تھی۔ اجڑی اجڑی اور ساتھ ہی میں اتنی آباد کہ بازار سے گزرتے ہوئے کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ یہ سب کھوے پناہ گیروں کے تھے جو رفتہ رفتہ پناہ گیر سے مہاجرین بن گئے۔ انہیں پناہ گیروں میں وہ ایک بوڑھیا بھی تھی جس کے منہ سے نکلا ہوا معصوم سا فقرہ عسکری صاحب نے لپک لیا اور اس میں سے پاکستان کا فلسفہ کشید کر لیا۔ ہمارے آگے آگے پناہ گیروں کی ایک ٹولی میں گھری چل رہی تھی اور اپنی رو میں بول رہی تھی۔ کہنے لگی اے بھیا ملک ولک کیا ہے۔ بس بچارے مسلمانوں نے لشٹم پشٹم ایک کچا گھڑا کھڑا کر لیا ہے۔ چلو سر چھپانے کو ایک کونہ تو مل گیا۔

اسی بازار کے ایک نکڑ پہ ایک دکان کے تھڑے پہ ایک میر صاحب بیٹھے تھے۔ پورا نام تھا میر عترت۔ مظفر نگر سے لٹ پٹ کر آئے تھے۔ مگر اس تھڑے پہ اکڑ ایسے بیٹھے تھے جیسے پشتوں سے یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ پان سگریٹ کی اس دکان پر گاہک تو کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ شعر و شاعری کا چسکا رکھنے والوں اور گپ ہانکنے والوں کی پھڑ جمی رہتی تھی۔ جب بے فکروں کا ہجوم زیادہ ہوا تو میر صاحب نے ایک اعلان نامہ لکھ کر دکان پر آویزاں کر دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ہمارے حلقہ خاص میں داخل ہونے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔ آدمی گریجویٹ ہو' خوش شکل ہو' مذاق سخن رکھتا ہو' زبان صحیح بولتا ہو۔

اس حلقہ خاص کے رکن رکین ڈاکٹر صفدر حسین تھے کہ وہ بھی مظفر نگر ہی سے تعلق رکھتے تھے اور اس دکان سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک مکان میں آ کر بسے تھے۔ دوسرا رکن جو مجھے یاد آ رہا ہے وہ سانولی رنگت والا گورنمنٹ کالج کا ایک ایم اے کا طالب علم تھا۔ نام تھا سلیم گیلانی جو شاعری سے زیادہ موسیقی کا دلدارہ تھا۔ آگے چل کر ریڈیو پاکستان کے واسطے سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔

تو کرشن نگر کا بازار تو بہت آباد تھا۔ مگر گلیاں اجڑی اجڑی نظر آتی تھیں۔ کتنے گھرانے ابھی تک بے آباد تھے۔ مکان بہت اچھے

بنے ہوئے' دو دو منزلہ' سہ سہ منزلہ۔ باہر تالے پڑے ہوئے۔ اندر فرنیچر سے آراستہ۔ نقشہ بتا رہا تھا کہ یہاں کوئی فساد نہیں ہوا۔ بس ان مکانوں کے مکین اچانک یہاں سے رخصت ہوئے اور اس طرح رخصت ہوئے ہیں کہ اوپر کی منزلوں کی جو کھڑکیاں کھلی تھیں وہ کھلی ہی رہ گئیں۔ دن میں ان مکانوں پر اداسی برستی۔ رات کے اندھیرے میں وہ بھوت بن جاتے تھے۔ اور جب تیز ہوا چلتی تو کھڑکیوں کے پٹ دھاڑ دھاڑ بولتے تھے۔

جو مکان آباد ہو گئے تھے وہ مکان اپنے مکینوں کے ساتھ گھلے ملے نظر نہیں آتے تھے۔ مکانوں کی اپنی شان' مکینوں کا اپنا رنگ۔ ایک ڈرائنگ روم کا نقشہ اب یہ تھا کہ اندر فرنیچر ایک کونے میں سمیٹ دیا گیا تھا۔ باقی جگہ میں بھونسہ بکھرا ہوا تھا۔ آگے برامدے میں بھینس بندھی ہوئی تھی۔

میرا عسکری صاحب کے ساتھ بسیرا تھا اور عسکری صاحب نے اپنے ایک پھپھیرے ممیرے یا خلیرے بھائی کے گھر میں چھاؤنی چھائی تھی۔ یہ گھر واجبی واجبی تھا۔ میں نے عسکری صاحب سے کہا کہ عسکری صاحب کرشن نگر میں یار تو بڑے اچھے اچھے اراستہ و پیراستہ مکانوں میں آ کر براجمان ہوئے ہیں۔ آپ کے بھائی نے یہ کیسا مکان الاٹ کرایا تھا۔ فرنیچر کے نام یہاں تو ایک کرسی بھی نظر نہیں آ رہی۔

کہنے لگے کہ اس مکان میں ایک ہی چیز ملی تھی وہ بھی مالک مکان آ کر لے گیا۔

میں نے پوچھا ''وہ کیا چیز تھی۔''

بولے ''تمہارے آنے سے کوئی دو تین دن پہلے ایک سکھ فوجی جیپ پر سوار پاکستانی پہرے میں یہاں آیا۔ کہا کہ ''یہ ہمارا مکان تھا۔ باقی سامان تو ہم نے سنگھوا لیا تھا۔ مگر یہاں ہماری مرغیوں کا ٹاپا رہ گیا ہے۔''

''مرغیوں کا ٹاپا'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

بولا ''بات یہ ہے جی کہ ٹاپا نہ ہونے کی وجہ سے مرغیوں کے سلسلہ میں ہمیں بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے ہمارا ٹاپا دے دیجئے۔''

سکھ فوجی نے ٹاپا جیپ پہ رکھا اور پاکستانی سپاہیوں کے پہرے میں بحفاظت تمام..... یہاں سے لے گیا۔

ارے یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے مجھے اپنے پہلے دن کا ذکر کرنا چاہیے۔ میں میرٹھ سے بستر بوریئے کے ساتھ سپیشل میں بیٹھا تھا۔ مگر جب لاہور میں قدم رکھا تو بستر بوریا غائب ہاتھ میں بس ایک بیگ تھا۔ یہ مت سمجھئے کہ میں لٹ پٹ کر پاکستان پہنچا تھا۔ بات یہ تھی

کہ میں نے اپنا بستر بوریا سازوسامان والے ڈبے میں سنگھوادیا تھا۔سپیشل نے ہمیں مغلپورہ سٹیشن پر انڈیلا اور اس بند ڈبے سمیت پنڈی روانہ ہوگی۔خیر پہلی رات تو جیسے تیسے گزرگئی۔صبح کو میں نے کہا کہ جاڑا تو شروع ہو چکا ہے۔بغیر لحاف گدے کے یہ راتیں کیسے گزریں گی۔عسکری صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔یہاں ایک لنڈا بازار ہے۔وہاں کمبل بہت سستے مل جائیں گے۔تو آج وہاں چلتے ہیں۔

مگر لنڈا بازار جانے سے پہلے عسکری صاحب نے گورنمنٹ کالج کا رخ کیا اور مجھے آفتاب احمد خاں سے ملایا۔لاہور میں اترنے کے بعد یہ میری یہاں کے کسی شخص سے پہلی ملاقات تھی۔پھر لنڈا بازار گئے۔کوڑیوں کے مول دو کمبل خرید لیے۔لیجئے ہماری تو عید ہوگئی۔لاہور کے کڑکڑاتے جاڑوں کو یہ ایک پناہ گاہ گیر کا دانداں شکن جواب تھا۔

دن ڈھلے عسکری صاحب بولے "چلو شاہد صاحب کی طرف چلتے ہیں۔"

"شاہد صاحب" میں نے حیران ہو کر عسکری صاحب کو دیکھا۔

"یار وہ خبر غلط تھی۔میں جب یہاں آیا تو شاہد صاحب صحیح وسالم یہاں آئے بیٹھے تھے۔"

اصل میں میرٹھ میں اڑتے اڑتے یہ خبر پہنچی تھی کہ جس سپیشل میں شاہد صاحب دلی سے چلے تھے وہ رستے میں پوری کٹ گئی۔شاہد احمد دہلوی خاندان سمیت اللہ کو پیارے ہوگئے۔

شاہد صاحب پاس جا کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک بزرگ بر میں اچکن' سر پہ ترکی ٹوپی' ٹانگوں میں تنگ موری والا پائجامہ' چہکتے بولتے زینے سے اترے اور محفل میں آن شامل ہوئے۔بامحاورہ اردو میں کتنا تیز تیز بول رہے تھے جیسے بھاڑ میں چنے بھن رہے ہوں۔پھر ایک جوان وارد ہوا۔گوری رنگت' لباس موسم سے بے نیاز' بر میں سفید اچکن' اس پر چوڑی دار سفید پائجامہ' سفید پاپوش۔انہوں نے چہکنا شروع کیا تو چہکتے بولتے بزرگ ماند پڑ گئے۔وہ بزرگ اشرف صبوحی تھے۔یہ جوان رعنا حکیم حبیب اشعر تھے۔لیجئے یکمشت اتنے دلی والوں سے نیاز حاصل ہوگیا۔بلکہ دلی سے شاید یہ میرا پہلا باقاعدہ تعارف تھا۔پھر شاہد صاحب نے اعلان کیا کہ بھئی میاں صاحب کی طرف چلنا ہے۔انہوں نے ہم سب کو سمیٹا اور چلے بارود خانے میاں ایم اسلم کی حویلی کی طرف۔

میاں ایم اسلم جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔سامعین فراہم ہو چکے تھے۔دیر کس بات کی تھی۔زیر تحریر ناول سنانا شروع کر دیا۔دو ڈھائی باب سنانے کے بعد بستر لپیٹا۔اب چائے کی پکار پڑی۔ناول خوب' چائے مرغوب' ہیرا منڈی سے آئے ہوئے خاص قسم کے سیخ کباب' گرم جلیبیاں' ساتھ میں برفی۔

جب ہم واپس ہو رہے تھے تو رات ہو چکی تھی۔ دن ڈھلے جو بازار اجڑا اجڑا نظر آیا تھا اب وہاں خوب بھیڑ بھڑکا تھا۔ یار اہلے گہلے پھرتے تھے۔ پاؤں زمین پر نظریں بالا خانوں پر پ روشن بالا خانوں میں روشن چہرے سجے ہوئے۔ کسی کسی بالا خانے سے ہار مونیم اور طبلے کی آواز آ رہی تھی۔ عسکری صاحب نے اس علاقے کا تعارف کراتے ہوئے مجھے بتایا کہ یہ ہیرا منڈی ہے۔ دلی میں چاوڑی بازار حسیناں کی منتقلی سے پہلے جو مقام حاصل تھا وہی اس بازار کا مقام ہے۔

تو یہ تھا پاکستان میں میرا پہلا دن جس کا خلاصہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ اول آفتاب احمد خاں' دوم لنڈا بازار' سوم میاں ایم اسلم' چہارم ہیرا منڈی۔ اول اول ان چار چیزوں کے واسطے سے میں نے پاکستان کو جانا۔ آج بھی ان چاروں اشیاء میں سے کسی ایک کو بھی منہا کر کے میں پاکستان کا تصور نہیں کر سکتا۔

لنڈا بازار تو خیر پاکستان کے اول دن کے بعد جانے کا موقع نہیں ملا۔ بیس بائیس سال بعد ایک مرتبہ کالم نگاری کی تقریب سے وہاں جانے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ مگر ہیرا منڈی سے ملاقات کی تقریب شاہد صاحب اور میاں ایم اسلم کے واسطے سے ایک ڈیڑھ ماہ تک مسلسل رہی۔ ایک رات میں نے اس راہ سے گزرتے ہوئے عسکری صاحب سے کہا کہ ''ہم روز رات کو یہاں سے گزرتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بھی تماش بین ہیں۔''

''ارے یار' تم نے ہیرا منڈی ابھی دیکھی کہاں ہے۔ طخیائیوں کی گلی دیکھی ہے۔ چلو آج ادھر سے چلتے ہیں۔''

طخیائیوں کی گلی۔ واہ واہ۔ ہجوم عاشقاں اتنا کہ سچ مچ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ کھڑا کھیل فرخ آبادی۔ سودا نقد۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ مال سامنے دروازے میں سجا ہوا۔ دام کرائے کا م۔ تیر کے موافق اندر گئے۔ شتابی سے فارغ ہو باہر آئے۔ پھر سٹ پٹ کرتے اپنی راہ ہو لیے۔

بس اسی طرح چلتے پھرتے مٹر گشت کرتے میں ایک ہفت روزہ کا مدیر بن گیا۔ ہوا یوں کہ بمبئی کے مشہور ہفت روزہ ''نظام'' کے مالک نے بمبئی سے اپنا کاروبار سمیٹا اور لاہور آ گئے۔ میاں ایم اسلم سے ایڈیٹر کے سلسلہ میں صلاح مشورہ کیا۔ میاں صاحب نے شاہد صاحب سے مشورہ کیا اور پھر میرا نام ادارت کے لئے پیش کر دیا۔ لیجئے ہم نظام کے ایڈیٹر بن گئے۔

نظام کا دفتر اول اول بینک سکوئر میں حبیب بینک بلڈنگ کی چوتھی یا شاید پانچویں منزل پر قائم ہوا تھا۔ مگر میں روز صبح کو اس بلڈنگ میں قدم رکھ کر سب سے پہلے بینک میں جھانکتا تھا۔ یہاں ایک کاؤنٹر پر یوسف بیٹھے نظر آتے تھے اور میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ ایک شاعر بینک کے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا کیسا لگتا ہے۔

ایک صبح میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ حبیب بینک کا ایک چپڑاسی ڈھونڈتا ڈھونڈتا میرے کمرے میں آیا۔ پوچھا ''انتظار حسین آپ ہیں جی۔''

میں نے کہا ''ہاں جی' کہو کیا بات ہے۔''

''جی تاڈا ایک مہمان ہندوستان سے آیا ہے۔''

''ہندوستان سے میرا مہمان۔ کیا نام بتایا اس نے۔''

''نام اس نے نہیں بتایا جی۔ نیچے بینک کے گیٹ پر کھڑا ہے۔''

میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا اور بینک کے گیٹ پر نظر ڈالی۔ ریوتی۔ میں سخت چکرایا۔ ہندو تو اب اس شہر میں نسخہ کے لئے نہیں ملتا۔ یہ کیسے اور کہاں سے نمودار ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ تیزی سے سیڑھیاں اتر نیچے پہنچا۔ سچ مچ سامنے ریوتی کھڑا تھا۔ کتنے اندیشوں اور وسوسوں نے مجھے ایک دم سے آ گھیرا۔ ''احمق' بے سوچے سمجھے منہ اٹھائے چلا آیا۔ مجھے پہلے بتایا تو ہوتا۔ پوچھا ہوتا۔''

''تو نے یہاں آتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا۔''

میں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ دفتر میں کسی کو بتاؤ مت کہ یہ مہمان ہے کون۔ مگر ریوتی شاید بمبئی میں نظام کے مالک یوسف چودھری سے مل چکا تھا۔ اس نے خود ہی ان سے علیک سلیک کر لی۔ اس سے میری بھی کچھ ہمت بندھی۔ بس پھر ایک ایک سے تعارف ہوتا چلا گیا۔ کسی کے ماتھے پر میں نے کوئی شکن نہیں دیکھی' چہرے پر نفرت کا کوئی شائبہ نہیں دیکھا۔ بس میں شیر ہو گیا۔ دفتر سے نکل کر ہوٹلوں میں جھانکا۔ ہاں اس وقت مجھے ایک مسئلہ کا احساس ہوا کہ اب یہ تو خالص مسلمانوں کا ملک ہے اور میرا دوست بھاجی ترکاری کھانے والی مخلوق۔

میں نے گھر جا کر عسکری صاحب سے ذکر کیا کہ ریوتی آ گیا ہے۔ یہ تو گوشت کیا پیاز کی بو سے بھی بدکتا ہے۔ میں اس کے کھانے کا کیا بندوبست کروں۔ وہ فوراً اندر گئے۔ اپنی والدہ سے یہ ذکر کیا۔ واپس آ کر کہا کہ والدہ کہتی ہیں کہ تمہارے دوست کے مہمان کے لیے دال سبزی کی ہنڈیا بے پیاز کی الگ پکے گی۔ مگر وہ مسلمان کے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا کھا بھی لے گا۔

ڈیڑھ دو ہفتے تک ریوتی کو شہر میں مختلف ادبی حلقوں میں لیے لیے پھرا۔ یہ سوچ کر کتنا اطمینان ہوا کہ لاہور فسادات کے اثرات سے بالکل باہر نکل آیا ہے۔ ہندو کو دیکھ کر خون بالکل نہیں کھولتا۔ بس تجسس ہوتا ہے۔

ویسے تو آنا جانا بند تھا۔ معمول کے ذرائع سفر معطل تھے۔ ہمت ہے تو سپیشل میں بیٹھ جاؤ کہ سپیشلیں آبادیوں کو ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ڈھو رہی تھیں۔ مگر سپیشل میں بیٹھنے کا مطلب یہ تھا کہ واپسی کا راستہ بند۔ پھر بھی گنے چنے لوگ خصوصی پرمٹ کے ذریعہ جانے آنے کی سبیل پیدا کر ہی لیتے تھے۔ آخر ریوتی آیا ہی تھا اور اطمینان سے واپس بھی گیا۔ بس ایسے ہی شاہد صاحب ایک روز دلی کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خون کی چڑھی ندی اب وہاں اتر گئی تھی۔ سو شاہد صاحب وہاں گئے اور ضروری کاغذات رسالے کتابیں سمیٹ کر واپس آئے۔ جب واپس آئے تو بھرے ہوئے تھے۔ فوراً ہی رپورتاژ لکھنے بیٹھ گئے۔

شاہد صاحب بھی خوب تھے۔ جب گھر سے قدم نکالتے تھے تو اکیلے کبھی نہیں ہوتے تھے۔ ایک پوری برات ساتھ ہوتی تھی۔ اشرف صبوحی، حبیب اشعر، عسکری صاحب اور اب میں اس برات میں شامل ہو چکا تھا۔ ایک شام شاہد صاحب نے پوری برات کے ساتھ کینال بینک کے ایک گھر پر جا کر دستک دی۔ پتہ چلا کہ یہ وہ گھر ہے جہاں حکیم اجمل خاں کی آل اولاد نے آ کر ٹھکانا کیا ہے۔ حکیم محمد نبی خاں میزبان بنے ہوئے تھے۔ دلی کے اجڑے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اصل میں یہاں شاہد صاحب کو اپنا وہ رپورتاژ سنانا تھا جو انہوں نے دلی کے حوالے سے لکھا تھا رپورتاژ خاصا طویل تھا۔ کتنی دیر تک شاہد صاحب سناتے رہے اور محفل پہ سناٹا چھایا رہا۔ مگر شاہد صاحب اس رپورتاژ کو پورا نہیں پڑھ سکے۔ پڑھتے پڑھتے اچانک ان کی آواز بھرا گئی۔ پھر رقت طاری ہو گئی۔ اور رقت بھی ایسی کہ ہچکی بندھ گئی۔

پھر وہ پوری محفل ہی محفل گریہ بن گی۔ بس ہم دو غیر دہلوی میں اور عسکری صاحب اپنی خشک آنکھوں کے ساتھ دم سادھے بیٹھے تھے۔

اب میں اس منظر کو دھیان میں لاتا ہوں تو دھیان زقند لگا کر اس سے کہیں بہت پیچھے پہنچ جاتا ہے۔ 1857ء کی قیامت میں بھی دلی سے ایک خلقت کو نکلنا پڑا تھا۔ خیر جب فرنگی حاکموں کا مزاج قدرے ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے خلقت کو واپس آنے کی اجازت دیدی۔ پھر بھی کتنے لوگ تھے کہ جنہیں اپنے شہر میں واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔ کتنوں کی زندگی کے باقی ایام اس طور گزرے کہ مستقل دلی کو یاد کرتے تھے اور روتے رہتے تھے۔ دلی نے ہمیشہ ہی وقفے وقفے سے اپنے گود کے پالوں کو بہت رلایا ہے۔ وہ اس کی گود سے چھٹ کر دربدر رلتے اور روتے پھرتے ہیں۔ ادھر یہ خاک و خون میں لوٹ کر پھر سے جی اٹھتی ہے۔ چولا بدل کر نئے نویلوں کو گود لے کر پھر خوش و خرم نظر آنے لگتی ہے۔ جب مولانا حالی دلی مرحوم کا فسانہ سنا رہے تھے عین اسی ہنگام اس خاکستر سے ایک نئی دلی جی اٹھنے کے لئے کسمسا رہی تھی۔ اور ادھر جب شاہد احمد دہلوی اپنے باپ دادا اور حکیم محمد نبی خاں کے باپ دادا والی دلی کی بربادی پر

اشک بہار ہے تھے تو ادھر دلی نے اپنی خالی ہو جانے والی گود کو تازہ وارد خانہ بربادوں کے لیے وا کر رکھا تھا۔ اور اب دلی میں پہلے سے بڑھ کر امی جمی ہے اور کسی کو یہ یاد بھی نہیں ہے کہ یہیں کسی کوچے میں بیٹھ کر شاہد صاحب کے دادا ڈپٹی نذیر احمد نے دلی کی نئی کہانی لکھی تھی اور جہاں بلی ماراں کے کوچے میں ایک نیا بازار لگا ہے وہاں آگے ایک دیوان خانہ تھا جہاں رنگ رنگ کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ رات کو شاعری اور داستان گوئی کی محفلیں۔ دن میں گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ مل کر سیاسی مسکوٹیں۔ دلی کے پرانے روڑے خاک ہوئے۔ اب دلی نئی نویلی ہے۔ نئے اس کے روڑے ہیں۔

مگر خیر یہاں ذکر ان دلی والوں کا تھا جنہوں نے دلی سے نکل کر لاہور میں چھاؤنی چھائی تھی۔ دلی کا پانی بہہ کر لاہور آیا۔ مگر نشیب کراچی میں تھا۔ آخر کے تئیں زیادہ پانی اسی نشیب میں جا کر مرا۔ مگر جنہیں کراچی جانا تھا وہ بھی ابھی لاہور میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

شاہد صاحب کی مار پانی کے تالاب سے بس بارود خانے تک تھی۔ یعنی گھر سے نکلے اور میاں ایم اسلم کی حویلی میں جا براجے۔ مگر اسی دوران انہوں نے ایک اور رستہ دیکھ لیا۔ آخر شاہی قلعہ بھی تو اسی نواح میں تھا۔ وہاں ولی اللہ صاحب جو دلی ہی کے ایک فرزند تھے ماہر آثار قدیمہ کی حیثیت سے خیمہ زن تھے۔ شاہد صاحب نے اور ان کے ساتھ اجڑے پجڑے دلی والوں نے اس طرف کا رخ کیا۔ ہفتے کے ہفتے اکٹھے ہوتے اور شاہی قلعہ میں بیٹھ کر لال قلعہ کو یاد کرتے۔ لگتا تھا کہ یہ شاہی قلعہ نہیں دلی والوں کی دیوار گریہ ہے۔

مشرقی پنجاب سے جو بچ کر آ سکتے تھے وہ پہلے ہی آ چکے تھے۔ اب ادھر بچا کون تھا جو آتا۔ دلی سے بھی جنہیں آنا تھا کم و بیش آ چکے تھے۔ مگر یو پی سے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ فساد آج اس نگر میں کل اس نگر میں۔ جو نگر فساد کی زد میں آتا وہاں سے مسلمان خلقت لٹ پٹ کر نکلتی اور پاکستان کی طرف چل پڑتی۔ لشٹم پشٹم واہگہ کی سرحد پر پہنچتے اور پھر سیدھے لاہور میں۔ ویسے تو یہ پانی بھی زیادہ تر کراچی ہی کی طرف بہہ رہا تھا۔ لیکن آنے والے پہلے لاہور کی خاک پھانکتے تھے۔ پھر آگے جاتے تھے۔

یو پی سے جو قافلہ آتا اس میں بقدر نمک شاعر بھی ہوتے۔ مگر قافلے آتے چلے جا رہے تھے اور لاہور میں نمک اکٹھا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ عالم ہوا کہ کرشن نگر شاعروں سے لبریز نظر آنے لگا۔ لاہور میں شاعر پہلے ہی کونسے کم تھے۔ اب خانہ برباد شاعروں کی لگاتار آمد سے شہر میں شاعروں کی ریل پیل ہو گئی۔ جو شاعر کرشن نگر میں آ کر پڑاؤ کرتا وہ پہلے میر عترت حسین کی چھتری پر گرتا۔ پھر وہاں سے سن گن لے کر سونگھتا سونگھتا مشاعرے میں جا پہنچتا۔ مشاعرے ان دنوں لاہور میں بہت ہو رہے تھے۔ کچھ لاہور کی اپنی مشاعروں کی روایت کچھ خانہ خراب شاعروں کے نام کی برکت۔ شہر میں مشاعرے زور پکڑ گئے۔ ادھر ہم شہر کی خاک

چھانتے پھرتے تھے۔ اجی ہم اس وقت کس گنتی میں تھے۔ اصل میں عسکری صاحب کے پاؤں میں سنیچر تھا۔ ٹھالی ٹھسکے' کرنے کو کچھ نہیں۔ قلم تو اس لیے رکا ہوا تھا کہ ''ساقی'' ابھی نکلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ شہر میں یوں ادبی رسالے کم نہیں تھے۔ مگر وہ تو ترقی پسند رسالے تھے۔ عسکری صاحب کو وہ وارا نہیں کھاتے تھے۔ اچھا پڑھنا بھی فی الحال موقوف تھا۔ میں نے تو ان دنوں عسکری صاحب کے ہاتھ میں صبح دوپہر شام رات کسی بھی وقت کتاب دیکھی نہیں۔ جیسے پڑھنے لکھنے سے جی اچاٹ ہو گیا ہو۔ بس واہی تباہی پھرتے رہتے تھے۔ جب تک ''نظام'' کے دفتر میں مصروفیت پیدا نہیں ہوئی میں بھی ان کے ساتھ لخ لخ پھرتا رہتا۔ صبح ہوئی اور نکل کھڑے ہوئے۔ پاؤں میں چکر تھا۔ جدھر بھی اٹھ گئے۔ گھوم پھر کر دو ڈھائی بجے گھر پہنچے۔ کھایا پیا' لیٹے بیٹھے۔ پھر عسکری صاحب کے پاؤں میں کھجلی ہونے لگی۔ پھر نکل کھڑے ہوئے۔ اب دن ڈھلے پاؤں ادبدا کر شاہد صاحب کی طرف اٹھ جاتے۔ وہاں دلی والوں کی پھڑ جمی ہوتی۔ اشرف صبوحی کی چٹاخ پٹاخ باتیں دلی کے محاورے کے چٹخارے کے ساتھ۔ وہ سانس لینے کے لیے رکے تو حبیب اشعر رواں ہو گئے۔ بیچ بیچ میں شاہد صاحب اپنے انداز میں فقرہ لگاتے۔ اور عسکری صاحب گم متھان۔ اور اچانک شاہد صاحب اٹھ کھڑے ہوتے۔ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ وہی میاں ایم اسلم کی بیٹھک۔ پھر بیٹھے ان کے ناول کا باب سن رہے ہیں اور پھر شاہی محلہ کی خاص دکان سے آئی ہوئی برفی' جلیبیاں اور کباب کھا رہے ہیں۔

میاں ایم اسلم کے یہاں سے نکلتے نکلتے رات ہو جاتی۔ شاہی محلہ لٹخیائیوں کی گلی۔ پھر گھر کی طرف۔ لیکن ابھی سے گھر جا کر کیا کریں۔ اور عسکری صاحب کو یاد آتا کہ آج تو فلاں جگہ مشاعرہ ہے۔ لیجیے مشاعرے میں گھس گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلتا ہے کہ یوپی سے کتنے اور شاعر لٹ پٹ کر اس مہاجر نواز شہر میں آن پہنچے ہیں۔ لاہوریوں نے لٹے پٹوں کے لیے دیگیں بہت پکائیں۔ خیر ان دیگوں کو تو میں نے آنکھ سے دیکھا نہیں۔ بس سنتے تھے۔ لیکن درماندہ شاعروں کی تواضع اپنی آنکھ سے دیکھی۔ گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے۔ پطرس بخاری صدارت کر رہے ہیں۔ اچانک کھڑے ہوتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ حضرات آج ہی یوپی سے ایک شاعر بے بدل ہمارے شہر میں وارد ہوا ہے اور اس مشاعرے میں موجود ہے۔ پھر بخاری صاحب نے اس شاعر بے بدل کی تعریف میں ایسا سماں باندھا کہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں جگر صاحب یا جوش صاحب تو ہجرت کر کے پاکستان نہیں آ پہنچے۔ آخر بخاری صاحب کا بھی تو اپنا ٹھسا تھا۔ چھوٹوں موٹوں کو وہ کب خاطر میں لاتے تھے۔ مگر جب وہ شاعر سٹیج پر نمودار ہوا تو عسکری صاحب بے ساختہ ہنسے۔ بولے' بخاری صاحب خواہ مخواہ ہم بہ رعب گانٹھ رہے تھے۔ ارے یہ تو نذر امروہوی ہے۔

ہجرت اور فسادات شاعروں کا ان دنوں مرغوب موضوع تھا۔ مشاعروں میں اس مضمون کو مقبولیت حاصل تھی۔ دل دکھے ہوئے

تھے۔شعر ذرا بھی اچھا ہوتا تو دل میں جا کر تیر کی طرح لگتا تھا۔شاعر کو اگر اس موضوع کے واسطے سے بھی داد میسر نہ آئی تو پھر یہ اس کی قسمت۔عبدالمجیب بھٹی نے اسی موضوع پر اپنے رنگ میں نئی نظم لکھی تھی۔عنوان تھا غنڈہ۔

میں تجھے قتل ہی کر دوں گا۔

مگر آج کی رات

اس کے بعد شاعر نے کیا کہا کچھ سمجھ میں نہ آیا۔مجمع نے غل مچانا شروع کر دیا۔غنڈہ ہے'غنڈہ ہے۔

بھٹی صاحب اپنے بھاری تن وتوش کے ساتھ سوٹ بوٹ میں ملبوس کس رکھ رکھاؤ سے سٹیج پر آتے تھے مگر ادھر ان کی زبان سے مصرعہ نکلا۔

''ہم تمہیں قتل ہی کر دیں گے مگر آج کی رات''

اور ادھر مشاعرے میں شور پڑ گیا.....غنڈہ ہے۔

بھٹی صاحب مستقل مزاج غضب کے تھے۔انہوں نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ہمیشہ مشاعرے میں اسی نظم کو پڑھنے پر بضد رہتے تھے۔اور ہر مشاعرے میں ہم نے یہ نظم شروع ہوتے تو دیکھی ختم ہوتے کبھی نہیں دیکھی۔

خواجہ دل محمد کیا بزرگ تھے۔ان مشاعروں میں شاعروں کی حد تک تو بس ایک ہی ترکی ٹوپی نظر آتی تھی اور وہ تھی خواجہ صاحب کی ٹوپی۔وہ بھی ہمیشہ ایک ہی غزل پڑھنے پر اصرار کرتے نظر آتے تھے۔اس غزل میں ذکر حسن یار کے ساتھ اللہ اکبر کا جملہ آتا تھا۔اسی کے ساتھ مجمع سے کوئی ایک آواز بلند ہوتی۔نعرۂ تکبیر اور مجمع پکار اٹھتا اللہ اکبر اور پھر نظم کا کوئی شعر سنائی نہ پڑتا۔

ہاں اس زمانے کا ایک شعر یاد آیا۔شعر بھی نرالا' شاعر بھی نرالا۔عسکری صاحب اور میں چلتے پھرتے لارنس باغ جا نکلے۔وہاں اوپن ائیر تھیٹر میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ہم نے جب وہاں قدم رکھا تو نقشہ یہ دیکھا کہ سٹیج پر ایک شاعر چہل قدمی کر رہا ہے۔گوری رنگت' چھریرا بدن' بر میں ململ کا کرتا' ٹانگوں میں پتلی موری کا پائجامہ' ہاتھ میں چھڑی' اوپن ائیر تھیٹر کے وسیع وعریض سٹیج پر ٹہلتا چھڑی گھماتا دائیں سے بائیں جاتا ہے' بائیں سے دائیں آتا ہے اور یہ شعر پڑھتا ہے۔

دیکھتا کیا ہے مرے منہ کی طرف
قائد اعظم کا پاکستان دیکھ

میں نے حیرت سے شاعر کو دیکھا اور عسکری صاحب سے پوچھا ''عسکری صاحب' یہ کون شاعر ہے۔''

''ارے ارے تم نہیں جانتے۔ یہ نفیس خلیلی ہیں۔''

یہ سارے مشاعرے ان دنوں کے ہیں جب ہم ٹھالی ٹھسکے واہی تباہی پھرتے تھے۔ پھر ہم کہاں مشاعرے کہاں۔ اس کے بعد نہ عسکری صاحب کو میں نے مشاعرے میں دلچسپی لیتے دیکھا نہ خود مجھے اس میں دلچسپی نظر آئی۔ اس کے بعد کا تو بس ایک ہی مشاعرہ مجھے یاد ہے۔ یہی کوئی ڈھائی تین سال کے بعد کا۔ اور کیا دھوم کا مشاعرہ تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وسیع ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ کیسا کیسا شاعر آیا بیٹھا تھا۔ سب سے بڑھ کر جگر صاحب جن کا اس زمانے میں پورے برصغیر میں طوطی بولتا تھا۔ چھوٹے موٹے شاعروں کو سامعین سننے پر امادہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ جو شاعر سٹیج پر نمودار ہوتا ہوٹ ہو کر رخصت ہوتا۔ اسی ہنگام ایک نئی ہی صورت سٹیج پر نمودار ہوئی۔ برس تیرہواں یا کہ چودہ کا سن۔ چھریرا بدن' بوٹا سا قد' گوری رنگت' بر میں سفید ساڑھی' بال کھلے ہوئے۔ آپ نے فلم ''جوگن'' تو دیکھی ہوگی۔ بس سمجھ لیں کہ یہ بی بی اس جوگن کی چھوٹی بہن نظر آ رہی تھی۔ وہ بھجن گاتی تھی۔ یہ غزل سرا تھی۔ درد اور سپردگی کا عالم وہی۔ ترنم قیامت۔ مضمون' ہجرت کا درد والم۔ لٹنے پٹنے گھر سے بے گھر ہونے کا دکھڑا۔ لگتا تھا کہ وہ سارا درد والم آواز میں گھل گیا ہے۔ ابھی یہ تجربہ ہمارے دل و دماغ میں زندہ تھا۔ سو جو شعر اس نے پڑھا دلوں میں جا کر ترازو ہو گیا۔ بس داد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ غزل ختم ہوئی تو دوسری غزل کی فرمائش۔ دوسری ختم ہوئی تو تیسری کی فرمائش۔ مجمع ہے کہ شاعرہ کو جس کا نام زہرہ نگاہ بتایا گیا تھا سنے جانے پر بضد تھا۔

منتظمین نے اپنی دانست میں بجا سوچا کہ جگر صاحب کو دعوت کلام دی جائے۔ مجمع مطمئن ہو جائے گا۔ سو جگر صاحب کا نام پکارا گیا۔ مجمع تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ جگر صاحب مائک کے سامنے تشریف لائے۔ ابھی وہ گنگنا رہے تھے کہ ایک طرف سے آواز آئی..... زہرہ نگاہ۔

بس پھر کیا تھا، چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ زہرہ نگاہ، زہرہ نگاہ۔

جگر صاحب چپ۔

جب شور نہ تھما تو خاموشی سے مائک کے سامنے سے سرکے اور اپنی نشست پر جا بیٹھے۔ پھر کیا ہوا' مجھے یاد نہیں آ رہا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ عابد علی صدارت کر رہے تھے۔ انہیں یہ گوارا نہیں ہوا کہ رئیس المتغزلین پر اس رنگ سے ایک نوخیز شاعرہ کو ترجیح دی جائے۔ نتیجہ ہنگامہ۔ میرا حافظہ آگے کچھ نہیں بتاتا۔

مگر اب جب میں پچاس برس بعد ان سارے مشاعروں کو تصور میں لا رہا ہوں تو مجھے نفیس خلیل اپنی سج دھج کے ساتھ سب

شاعروں پر چھائے نظر آ رہے ہیں۔ جیسے مشاعرہ اسی رنگ سے گرم ہے اور نفیس خلیلی چھڑی گھماتے ہوئے اوپن ائیر تھیٹر کے وسیع سٹیج پر ٹہل رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں

دیکھتا کیا ہے مرے منہ کی طرف
قائد اعظم کا پاکستان دیکھ

◆◆◆

منٹو عسکری شیریں تثلیث بمقابلہ ترقی پسند تحریک

قیامت خیز 1947ء ختم ہوا۔ اب 1948ء شروع ہو رہا تھا۔ خیر ویسے تو سال آتے جاتے رہتے ہیں۔ ماہ و سال کا بے انت سلسلہ کب سے چلا آ رہا ہے۔ بیچ بیچ میں ایسے سال بھی آتے ہیں جنہیں تاریخ ساز کہیں تو بجا ہے۔ مگر یک لخت دنیا ہی بدل جائے' ایسا قیامت کا سال تو کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ بھلا مجھے یہاں آئے ہوئے ایسا کونسا زمانہ بیتا تھا۔ یہی کوئی دو ڈھائی مہینے مگر لگ رہا تھا کہ ایک پورا زمانہ پیچھے چھوڑ آیا ہوں اور اب اور ہی زمانے میں سانس لے رہا ہوں۔ زمین و آسمان بھلا اس طرح بھی بدلتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان اور تھے۔ ان کی بو باس اور تھی۔ یہاں زمین و آسمان اور تھے۔ بو باس ان کی اور تھی۔ چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھے ایک نئے ذائقے کا احساس ہوتا۔ یہ اچھا لگتا۔ مگر چھوڑی ہوئی زمین بھی اپنی ساری بو باس کے ساتھ تصور میں منڈلاتی رہتی۔ بلکہ اس کی بو باس کو تو اب' اس دیار میں آ کر جان رہا تھا۔ وہاں تو یہ شعور ہی نہیں تھا کہ کس ہوا میں سانس لے رہے ہیں' کن موسموں میں بسر کر رہے ہیں۔ دنیا بدل گئی تو اوجھل ہو جانے والی دنیا کی قدر معلوم ہوئی۔

بہر حال اب اس شہر میں میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئی تھیں۔ اب تک تو یہ تھا کہ عسکری صاحب مجھے سات گھر جھنکاتے پھرتے تھے۔ ان کی انگلی پکڑے مستقل شہر کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ ''نظام'' سے وابستہ ہونے کے بعد ان کی راہ الگ' میری راہ الگ۔ ان کا وہی طور کہ جلے پاؤں کی بلی بنے پھرتے ہیں۔ مگر میں ہلہ سے لگ چکا تھا۔ ان کے ساتھ اب پہلے کی طرح گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔ یوں انہوں نے اپنے لیے ایک مصروفیت پیدا کر لی تھی۔ مکتبہ جدید کے لئے فلابیر کا ''مادام بواری'' ترجمہ کرنے بیٹھ گئے۔ مگر پھر بھی بیٹھے کہاں۔ صبح ناشتہ کے بعد ڈیڑھ دو گھنٹے اس کام میں لگاتے۔ اس طرح کہ وہ بولتے جا رہے ہیں اور ان کے بھائی محمد حسن مثنیٰ لکھتے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد نکل کھڑے ہوئے۔ شام کو جب میں لوٹتا تو عسکری صاحب کو غائب پاتا۔ پھر میرا وقت عسکری صاحب کے بھائیوں کے ساتھ گزرتا۔ حسن مثنیٰ' حسن ثالث' حسن رابع۔ مگر میں کونسا روز پابندی سے شام کو واپس گھر آ جاتا تھا۔ عسکری صاحب نے شہر سے جتنا تعارف کرایا کرا دیا۔ میں اب اپنے طور پر شہر کو دریافت کر رہا تھا۔ ادبی حلقوں میں گھسنے اور میل ملاقات پیدا کرنے کے لئے میرے پاس ایک بہانہ بھی تھا۔ آخر ''نظام'' کو چلانے کے لئے مجھے لکھنے والوں سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے تھا۔ تو اب مجھے پتہ چل رہا تھا کہ حلقہ ارباب ذوق کیا چیز ہے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا کیا رنگ ہے۔

سچی بات ہے شروع میں تو مجھے انجمن ترقی پسند مصنفین ہی میں کشش محسوس ہوئی تھی۔ حلقہ کی محفل تو سوئی سوئی لگتی تھی۔ انجمن کے جلسوں میں بہت گرما گرمی ہوتی تھی۔ رنگ رنگ کے لوگ اور سخت گرما گرمی بحث۔ میں نے اپنا افسانہ بھی پہلے پہل یہیں پڑھا تھا۔ کہہ لیجئے کہ پہلے مجھے انجمن ہی نے گھاس ڈالی تھی۔ حلقہ میں تو مہینوں بعد مجھے اپنا افسانہ سنانے کا موقعہ میسر آیا۔ کتنے لکھنے والوں کو خاص طور پر اپنے ہمعصروں کو یہیں سے جانا اور پہچانا۔

عسکری صاحب ایک روز کہنے لگے کہ ''یار ایک عجب نوجوان ہے۔ میں مال روڈ سے کسی وقت بھی گذروں وہ کتابیں بغل میں دابے کسی طرف سے آن پہنچتا ہے اور پھر عالمانہ انداز میں ادب پر گفتگو شروع کر دیتا ہے۔''

میرے کان کھڑے ہوئے۔ پوچھا ''کیا حلیہ ہے اس کا۔''

''عینک لگاتا ہے۔ کچھ گول مٹول سا ہے۔ بغل میں کتابیں ہوتی ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے اعتماد سے کہا ''وہ گورنمنٹ کالج کا ایک طالب علم ہے مظفر علی سید۔''

''یار بہت عالمانہ گفتگو کرتا ہے۔''

مظفر کو سب سے پہلے میں نے انجمن کے جلسہ میں دیکھا تھا۔ اس اعتبار سے کہ میں نے جو وہاں افسانہ ''استاد'' سنایا تھا اس پر سب سے بڑھ چڑھ کر اسی نے اعتراض کیے تھے۔ اس مجمع میں برابر برابر دو چہرے عینکوں والے مجھے نظر آ رہے تھے۔ اور دونوں اس افسانے پر رواں تھے۔ چونکہ دونوں ہی عینکوں والے چہرے تھے اس لیے مجھے ان میں فرق کرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ایک عینک والا چہرہ ابن انشاء کا تھا۔ دوسرا مظفر علی سید کا۔

جب میں افسانہ پڑھ کر نکلا تو مشاعرے کے دو نامور شاعروں نے جو اس جلسہ سے نکل رہے تھے، مجھے روکا ''میاں سنو۔''

میں ٹھٹھک گیا۔

''یہ تم نے زبان کہاں کی لکھی تھی۔ کہیں تم بلند شہر کی طرف کے تو نہیں ہو۔''

یہ مولانا ماہر القادری تھے۔ ان کے ساتھ صابر دہلوی تھے۔

''جی ادھر ہی کا ہوں۔''

''کس جگہ کے۔''

''ڈبائی۔''

''اچھا اچھا' مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا۔ تمہارا لہجہ چغلی کھا رہا تھا۔''

ہماری ڈبائی کی ایک نواحی بستی تھی قادری باغ۔ اسے ہم لوٹ ڈبائی کہا کرتے تھے۔ سٹیشن جاتے ہوئے رستے میں آتی تھی۔ ماہر القادری وہیں کے رہنے والے تھے۔ اگست کے آس پاس کے دنوں میں میرٹھ میں بیٹھے بیٹھے میں نے سنا کہ آس پاس کی بستیوں کے جاٹوں نے مل کر قادری باغ پر حملہ بول دیا۔ مگر ماہر القادری نے ایک پر جوش نظم پڑھ کر مسلمانوں میں مقابلہ کا جوش پیدا کر دیا۔ ہمت سے لڑے۔ جاٹوں کو پسپا ہونا پڑا۔ مگر لڑائی ختم تو نہیں ہوئی تھی۔ حملہ پھر ہوا۔ اور جاٹ ہاتھیوں پر چڑھ کر آئے۔ ادھر تیاری تو بہت تھی۔ مگر اب وہاں انہیں جوش دلانے کے لیے ماہر القادری نہیں تھے۔ وہ پاکستان جا چکے تھے۔ قادری باغ والوں نے مقابلہ کی تیاری کی تھی۔ اور ایک دیسی قسم کی توپ بنائی تھی۔ مگر وہ پورس کا ہاتھی ثابت ہوئی۔ کچھ عجب طریقہ سے انہوں نے اسے فٹ کیا اور چلایا کہ جاٹوں کو بھوننے کی بجائے اس نے قادری باغ والوں ہی کو بھون ڈالا۔

خیر میں ذکر مظفر علی سید کا کر رہا تھا۔ اس نے بھی پہلا سوال افسانے کی زبان کے حوالے سے اٹھایا تھا۔ مجھے اس وقت کیا پتہ تھا کہ ہمعصر ادب میں جو زبان چالو ہے میں اس سے انحراف کر رہا ہوں اور یہ کہ یہ انحراف آگے چل کر مجھے بہت رسوا کرے گا۔ مظفر نے جلسہ میں اس زبان اور اس انداز بیان پر جانے کیا کیا کہا۔ مگر شاید یہی چیز میرے اور اس کے درمیان ربط وضبط کا بہانہ بن گئی۔ مال روڈ پر چلتے چلتے ادبدا کر اس سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ مگر مال روڈ پر کتنی باتیں ہو سکتی تھیں۔ سو کسی ریستواں کا رخ کیا جاتا۔ اصل میں اس زمانے میں مال روڈ اچھی خاصی سیر گاہ تھی۔ چلتے چلتے کتنے ادیبوں دانشوروں سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی۔ اور اس راہ پر ریستواں بھی تو بہت تھے۔ اور جس ریستوراں میں قدم رکھو وہاں ادیبوں کی یا ادیبوں سے ملتی جلتی مخلوق کی کوئی ٹولی براجمان نظر آتی۔ خیر ان ریستورانوں کا حال تو میں آگے چل کر سناؤں گا۔ آخر میں نے ساری عمر ٹی ہاؤس ہی میں تو صرف نہیں کی ہے۔ ناصر کاظمی کے طفیل میٹرو ہوٹل سے لے کر بھاٹی دروازے کے آس پاس سڑک کنارے بیٹھے چائے والوں کی دکانوں تک ہر مرتبہ اور ہر رنگ کے ہوٹل اور چائے خانے کا ذائقہ چکھا ہے۔ لیکن اس وقت اس زمانے کے حوالے سے ایک ریستوراں تصور میں گھوم رہا ہے۔ کیفے اورینٹ۔ پاکستانی ادب کے سوال پر عسکری صاحب اور ترقی پسندوں میں کیا معرکہ آرائی ہوئی' یہ تو پاکستانی ادب کے طالب علم کو معلوم ہونا ہی چاہیے۔ لیکن یہ شاید کسی ہی کو پتہ ہو کہ کیفے اورینٹ نے اس آگ کو بھڑکانے میں کیا کام دکھایا۔

میں ابھی ذکر کر رہا تھا کہ عسکری صاحب ان دنوں زمین کا گز بنے ہوئے تھے۔ صبح گھنٹے دو گھنٹے ''مادام بواری'' کے کچھ صفحے ترجمہ کیے۔ اس کے بعد وہی پاؤں کا چکر کہ بس بر میں اچکن ڈال' گلے میں مفلر لپیٹ نکل کھڑے ہوئے۔ گورنمنٹ کالج ان کا پہلا پڑاؤ